دعوت عام کی بنیادیں

خرم مرادؒ

(دوسری اور آخری قسط)

لوگوں میں ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ دین مشکل ہے۔ اس پر چلنا محال ہے۔ یہ بہت نیک' پارسا اور متقی لوگوں کا کام ہے' عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ دعوت عام کے حوالے سے اس غلط تصور کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت دین آسان ہے' انسان کی فطرت کے مطابق ہے' اور ہمارے تمام مسائل کا حل دین ہی میں ہے۔ یہ دعوت دین کی بنیادوں میں سے ایک اہم بنیاد ہے۔

دین آسان ہے

اللہ تعالیٰ نے دین آسان بنایا ہے۔ آغاز میں دین کا نام "اسلام" معروف نہیں تھا۔ یہ نام بعد میں قرآن میں نازل ہوا اور لوگوں نے اس کو اختیار کیا۔ شروع میں اس کا نام "الخیر" تھا۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دین مرد و عورت' بچے اور بوڑھے' پڑھے لکھے اور اَن پڑھ' ہر انسان کے لیے ہے تو دین کا کوئی ضروری مطالبہ ایسا نہیں ہو سکتا جو عقلی و منطقی طور پر عام آدمی کے بس میں نہ ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسا مطالبہ کرے جو عام آدمی کے بس سے باہر ہو' جس کے معنی ہیں کہ وہ آدمی اس کو پورا نہیں کر سکتا' تو یہ خلاف انصاف ہو گا۔ قرآن میں آتا ہے: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ط (البقرہ ۲: ۲۸۶) "اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"۔ لہٰذا دین کے مطالبات کسی عام انسان' مرد و عورت' بچے اور بوڑھے کی وسعت سے باہر نہیں ہو سکتے۔ یہ مطالبات بہ تدریج بڑھ سکتے ہیں لیکن رسائی سے باہر نہیں ہو سکتے۔ تمام علما اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ جب اللہ نے دین کو لازم کیا ہے تو یہ آسان ہونا چاہیے' مشکل نہیں ہو سکتا۔ یہی میرا نقطۂ نظر ہے کہ اگر قربِ الٰہی اللہ کو مطلوب ہے تو یہ راستہ مشکل نہیں ہو سکتا۔

یہ بات واقعتاً صحیح ہے کہ جو بات بھی اللہ نے لازم کی ہے وہ مشکل نہیں ہو سکتی۔ اللہ نے بار بار کہا

ہے کہ ہم آسانی چاہتے ہیں' مشکل نہیں چاہتے ہیں۔ انسان ضعیف' کمزور اور عجلت پسند ہے۔ ہم نے احکام کو ہلکا کر دیا ہے۔ ابتدائی دور میں رات کی نماز میں تہجد کے دو نفل مشکل ہوئے تو پانچ وقت کی نماز فرض کر دی۔ ایک مسلمان کو ۱۰ کے مقابلے میں لڑنے کا حکم تھا' اس کو آسان کر دیا۔ جب وراثت کے احکام آئے تو اللہ نے کہا: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ (البقرہ ۲: ۱۸۵) "اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے"۔ جب اللہ تعالیٰ آسانی چاہتا ہے تو پھر بندوں کو دین کو مشکل بنانے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو مطالبات جیسے رکھے ہیں ان کو اسی درجے میں رکھنا اور اسی مقام پر رکھنا' یہ لازمی اور ناگزیر ہے۔

دین کو اتنا مشکل بنانا کہ عام آدمی اس کا بوجھ نہ اٹھا سکے' یہ حضورؐ کا راستہ نہیں تھا۔ حضورؐ کا راستہ تو دین کو آسان اور ہلکا بنا کر پیش کرنا تھا۔ چند مثالیں پیش کروں گا جن سے اندازہ ہو گا کہ کیسے ایک عام آدمی دین کا بوجھ اٹھا سکتا ہے' اور اپنی خرابیوں' کمزوریوں' لاچاریوں اور ضعف کے باوجود اس پر چل سکتا ہے۔ ہم دین کے دائرے میں رہ کے ان کے لیے سہولت پیدا کریں' یہ ہمارا طریقہ ہونا چاہیے۔

قرآن مجید کی آیت فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؁ (اللیل ۹۲: ۷) کا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ ہم راستے کو اس کے لیے آسان کر دیں گے بلکہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے"۔ اس پر غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ راستہ تو ہے ہی آسان' یہ تو آدمی کی فطرت کی کجی ہے اور اس کا ٹیڑھ پن ہے جو راستے کو مشکل بنا دیتا ہے۔ یعنی ہم اس کو' اس کی فطرت کو' اس کی طبیعت کو' اس راستے کے لیے آسان کر دیں گے۔ گویا دین کا راستہ آسان ہے' اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ اللہ کی طرف چلنا' اس تک پہنچنا' اس کی مرضی پوری کرنا اگر اتنا مشکل کام ہوتا تو وہ ہم سے مطالبہ ہی نہ کرتا۔

اللہ نے دین کو آسان کرنے کا نسخہ بھی بتایا ہے۔ یہ نسخہ کوئی بہت مشکل نسخہ نہیں ہے بلکہ آسان ہے۔ سورہ بقرہ کے آخری رکوع میں ایک دعا ہے:

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج (البقرہ ۲: ۲۸۶) مالک ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال' جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔

مفسرین کے نزدیک "اِصْرًا" کے معنی بیڑی اور بوجھ کے ہوتے ہیں۔ اس سے دین کے مسائل کا وہ بوجھ مراد ہے جو بنی اسرائیل نے اپنی قوم پر مختلف پابندیوں کی صورت میں ڈال دیا تھا۔ نبی یہ بوجھ اتارنے کے لیے آتے تھے۔ یہ زنجیریں اور بیڑیاں وہ ہیں جن کے بارے میں فرمایا: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط (الاعراف ۷: ۱۵۷) "وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے' بدی سے روکتا ہے' ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے' اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا

ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے"۔

تدریج کا عمل

دین کے چند اصول ہیں جن میں ایک تدریج ہے۔

دعوت عام کے حوالے سے تدریج کا اصول نہایت اہم اصول ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دین میں سارے اعمال ایک درجے کے نہیں ہیں۔ ہمارے فقہا نے اس تدریج کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ فرائض اور سنن' سنت موکدہ اور سنت غیر موکدہ' نوافل اور مستحب' یہ دراصل ایک ترتیب ہے جو بڑی پُر حکمت اور دین کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔ گویا سارے اعمال ایک درجے کے نہیں ہیں۔ اگر کوئی سارے اعمال کو ایک درجے کا بناتا ہے تو وہ دین کو مشکل بناتا ہے۔ حضورؐ کی پوری سنت اور اسوہ یہی تھا کہ آپؐ فرائض کا مطالبہ پہلے کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ دین کے دوسرے تقاضے پیش کرتے تھے' اور باقی چیزوں کو جو مباح تھیں' ان میں آزاد چھوڑتے تھے۔

جب تدریج کا نظام خلط ملط ہو جاتا ہے تو پھر لوگوں کے لیے بوجھ اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے علما نے یہی کیا تھا۔ نتیجتاً ایک کے بعد ایک' ایک کے بعد ایک' مسائل اتنے پیچیدہ ہوتے چلے گئے کہ عام آدمی کے لیے دین کی ذمہ داریاں نبھانا مشکل ہو گئیں۔ ان کے لیے دین ایک بوجھ بن گیا۔ حضرت مسیحؑ نے انجیل میں بنی اسرائیل کے علما سے بڑے خوب صورت انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے تقریر کی ہے کہ تم اپنے لیے مجلسوں میں اعلیٰ مقام چاہتے ہو' تم چاہتے ہو کہ تمھیں اونچی جگہ بٹھایا جائے' لوگ تمھارا لباس اٹھا کے تمھارے ساتھ ساتھ چلیں' تمھارے ساتھ مصافحے کریں مگر تم نے دین کو اتنا بوجھل بنا دیا ہے کہ کوئی عام آدمی اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا' اور پھر تم انگلی بھی نہیں ہلاتے ہو کہ لوگوں کی مدد کرو تاکہ وہ دین کا بوجھ اٹھا سکیں۔ یہ تقریر انجیل میں موجود ہے۔ آج ہمارے ہاں بھی دین کی کچھ ایسی ہی حالت بنا دی گئی ہے۔

دین کے مطالبات میں حضورؐ نے تدریج کی حکمت کو پیش نظر رکھا ہے۔ ایک تدریج تو وہ ہے جو قرآن حکیم اور شریعت کے ساتھ نازل ہوئی۔ حضورؐ نے صرف کتاب اور احکام کی تعلیم نہیں دی تھی بلکہ حکمت کی تعلیم بھی دی تھی۔ کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلاً مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ ۲:۱۵۱) "ہم نے تمھارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا' جو تمھیں ہماری آیات سناتا ہے' تمھاری زندگیوں کو سنوارتا ہے' تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے' اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے' جو تم نہ جانتے تھے"۔ آپؐ کی اس تعلیم کتاب و حکمت میں تدریج کا پہلو ایک بہت بڑی حکمت ہے۔

تدریج کے مختلف پہلو

○ ایک موقع پر جب آپؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو آپؐ نے انھیں چند ہدایات دیں۔ اس میں ایک تدریج تھی۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ تم پہلے ان کو ایمان کی دعوت دینا۔ جب وہ اسے مان لیں تو پھر ان کو بتانا کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ جب وہ اسے مان لیں تو بتانا کہ زکوٰۃ بھی فرض ہے۔ جب وہ اسے مان لیں تو ان کو دین کے دوسرے فرائض بتانا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: آسانی پیدا کرنا، تنگی مت پیدا کرنا، اور خوشخبری دینا، اور لوگوں کو دین سے مت بھگانا۔ یہاں آپؐ نے خود تدریج کا حکم واضح کیا۔

○ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ شراب کی بندش کا حکم تین مراحل میں آیا۔ پہلے مرحلے میں یہ حکم آیا کہ شراب کے نقصانات زیادہ ہیں۔ اس طرح سے لوگوں کو نقصان کی طرف توجہ دلائی گئی اور شراب کی حرمت کا اشارہ دیا گیا۔ دوسرے مرحلے میں یہ حکم آیا کہ نشے کی حالت میں نماز مت پڑھا کرو۔ اس طرح بے شمار لوگوں نے اشارہ پا لیا۔ لیکن غزوۂ احد تک حضرت حمزہؓ اور بڑے بڑے صحابہؓ شراب پیا کرتے تھے۔ اس کی روایات موجود ہیں۔ اس کے بعد جب حکم آیا کہ شراب حرام ہے، رک جاؤ تو سب رک گئے۔ اس تدریج سے یہ حکم نافذ ہوا۔ اس کے بعد وہ جو بات کہتی ہیں بڑی قابل قدر ہے کہ اگر پہلی دفعہ میں حکم آتا کہ رک جاؤ تو لوگ ماننے سے انکار کر دیتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو حضورؐ کے ساتھ چل رہے تھے، آپؐ پر ایمان لائے تھے، جنھوں نے آپؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی تھی۔ ان کے بارے میں وہ کہہ رہی ہیں کہ وہ ماننے سے انکار کر دیتے۔ یہ تدریج کے اصول کی ایک عمدہ مثال ہے۔

○ دین میں تدریج کے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہؒ نے ۱۰، ۱۱ باتیں گنوائی ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے کہا کہ لوگوں کی فطرت میں تفریح کا ذوق بھی ہے۔ اس لیے دین میں جمعہ اور عیدین کے موقع پر اچھے کپڑے پہننے اور خوشبو لگانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح خوشی کے موقع پر دف بجانے کی اجازت دی گئی۔ نبی کریمؐ نے خود عید کے موقع پر لڑکیوں کو گانے اور دف بجانے کے لیے کہا کہ آج تو عید کا دن ہے، خوشی کا دن ہے۔ اس طرح شریعت کی حدود میں جتنی گنجایش ہو سکتی تھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رکھی۔

○ لوگ فطرتاً حسن کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے بدصورت آدمی کی امامت کو آپؐ نے پسند نہیں کیا۔ لوگ اپنے قبیلے کے آدمی کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں، اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ باہر کا امام مقامی امام کو ہٹا کر امام نہ بنے۔ ایک بار آپؐ نے سیدہ عائشہؓ سے فرمایا کہ خانہ کعبہ سنت ابراہیمؑ پر قائم نہیں ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کو دوبارہ توڑ کے ابراہیمی بنیاد پر قائم کروں۔ پھر ایک دروازہ آنے کے لیے

ایک دروازہ نکلنے کے لیے بناؤں۔ لیکن پھر حضرت عائشہؓ سے کہا کہ تمھاری قوم اس کو پسند نہیں کرے گی' ابھی ابھی مومن ہوئے ہیں' اس لیے میں نہیں کرتا۔ یوں آپؐ نے ارادہ ترک فرما دیا۔

نبی کریمؐ کا ایک اصول تھا کہ دین کا نفاذ چھوٹی چھوٹی باتوں کے بجائے بنیادی باتوں سے کیا جائے۔ احادیث میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ان سب مثالوں سے کچھ اصول نکلتے ہیں۔

○ مثال کے طور پر آپؐ نے نماز میں طویل قرأت سے منع فرمایا ہے۔ ایک جگہ حضرت معاذ بن جبلؓ جا کر نماز پڑھاتے تھے۔ وہ جاتے ہی سورہ البقرہ شروع کر دیتے تھے۔ نماز میں مزدور اور کسان شریک ہوتے تھے۔ وہ لوگ دن بھر کی محنت مزدوری سے تھکے ہوتے تھے۔ ان کے لیے لمبی نماز پڑھنا مشکل تھی۔ انھوں نے نماز پڑھنا ہی چھوڑ دی۔ حضورؐ بہت ناراض ہوئے' ان کو بلایا اور پوچھا کہ تم نے کیوں نماز پڑھنا چھوڑ دی؟ انھوں نے کہا کہ ہم دن بھر کی مزدوری سے تھکے ہارے آتے ہیں اور یہ لمبی لمبی قرأت کرتے ہیں۔ ہم تو نہیں سن سکتے۔ آج اگر کوئی یہ بات کہے تو علما فتویٰ جاری کر دیں کہ تم کیسے مسلمان ہو' قرآن نہیں سن سکتے۔ حضورؐ نے ناراضی کا اظہار کیا اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے یہ کہا کہ دیکھو لوگوں کو متنفر مت کرو۔ سورہ الضحیٰ' الم نشرح' والیل' چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھو۔ لمبی سورتیں مت پڑھو۔

○ نبی کریمؐ نے ہر جگہ اس حکمت کو ملحوظ رکھا کہ لوگ فرائض کے پابند رہیں اور دیگر مطالبات میں ایک تدریج رکھی۔ نبی کریمؐ کے پاس جو وفود قبول اسلام کے لیے آتے تھے' آپؐ نے ان کے ساتھ کس حکمت سے تدریج کے اصول کو استعمال کیا وہ قابل غور ہے۔ ایک موقع پر ایک آدمی نے آکر پوچھا کہ دین کیا ہے؟ اس نے بڑے تفصیلی سوال کیے۔ بڑا پیارا انداز تھا۔ اس نے کہا کہ آپؐ کو نبی بنا کر بھیجا گیا ہے' کیا آپؐ قسم کھا سکتے ہیں؟ آپؐ نے کسی ناراضی کا اظہار نہ کیا۔ پھر اسے دین کے چند احکامات کے اتباع کے لیے کہا۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ بدو تھا اس سے اتنا ہی مطالبہ ہو سکتا تھا۔ مگر سب سے یہ مطالبہ نہیں تھا۔ اسی طرح قبیلہ ثقیف شراب نوشی کے لیے بڑا معروف تھا۔ قبیلے کے لوگوں نے کہا کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں' طائف میں بڑی سردی پڑتی ہے' ہمیں شراب پینے کی اجازت دی جائے۔ آپؐ نے منع کر دیا لیکن وہ شراب پیتے رہے۔ حضورؐ نے تدریج کی حکمت اپنائی' یہاں تک کہ انھوں نے شراب نوشی ترک کر دی۔

○ ایک صحابی حضرت ابو محجن ثقفیؓ تھے جن پر شراب پینے کی وجہ سے کئی دفعہ حد نافذ ہو چکی تھی مگر پھر شراب پی لیتے تھے۔ ایک جنگ کے موقع پر انھوں نے شراب پی تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ان کو بیڑیاں پہنا کر قید کر دیا اور ان پر حد جاری کی۔ معرکہ چھڑا تو مسلمانوں کے اوپر مصیبت پڑ گئی۔ انھوں نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی بیوی سے کہا کہ آپ میری بیڑیاں کھول دیں اور گھوڑا دے دیں۔ پہلے تو وہ ہچکچائیں کہ قیدی ہے' شرابی ہے' میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔ بالآخر انھوں نے ان کی بیڑیاں کھول دیں

اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا اپنا گھوڑا انھیں دے دیا۔ وہ بیمار تھے اور پیچھے سے بیٹھے کمانڈ کر رہے تھے۔ حضرت ثقفیؓ گھوڑے پر سوار ہوئے اور وہ داد شجاعت دی کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حیرت سے دیکھتے رہ گئے کہ گھوڑے پہ یہ کون سوار ہے کہ جس نے صفیں کی صفیں پلٹ دیں۔ جب جہاد ختم ہو گیا تو وہ واپس آئے، گھوڑا واپس کیا، بیڑیاں پہنیں اور پھر بیٹھ گئے۔ بعد میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ آئے، پوچھا کہ یہ کون تھے؟ ان کی بیوی نے کہا کہ وہ یہ تھے۔ اس پر انھوں نے ان سے حد معاف کر دی۔ ہمارے علما کا تقریباً اجماع ہے کہ جہاد کے زمانے میں حدود نافذ نہیں ہونی چاہییں۔ حدود نافذ ہونے سے لوگ برگشتہ ہوں گے اور دشمن سے مل سکتے ہیں۔ ان کے سامنے دین کے لیے مصلحتیں اور حکمتیں تھیں۔ وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے اور دین کے وفادار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انسانی معاشرے میں مصلحت کے ساتھ دین کو آسان بنا کے لوگوں کو مجتمع کرنا اور قوت بنانا ضروری ہے۔ اسی کے نتیجے میں انھوں نے انسانوں کی ایک قوت جمع کر لی۔ وہ سب مختلف رنگ و نسل کے لوگ تھے لیکن جہاد کے مقصد کے لیے جمع ہو گئے۔ ۱۰۰ برس کے عرصے میں وہ سندھ، بلوچستان، مصر، شام، لیبیا، الجزائر، سمرقند اور بخارا اور کہاں کہاں نہیں پہنچ گئے!

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تدریج کا اصول ہی ہے جس پر عام لوگ جمع ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ دین کو حکمت کے ساتھ لے کر چلا جائے اور لوگوں سے وہ مطالبات کیے جائیں جو وہ پورے کر سکیں۔ ان پر آہستہ آہستہ بوجھ ڈالا جائے اور بہ تدریج دین کے مطالبات پورے کرنے کا تقاضا کیا جائے۔ اسی طرح سے جس طرح ایک پہلوان اپنی قوت و طاقت کے لحاظ سے ورزش کرتا ہے اور بہ تدریج اس میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے ہی دن ۱۰۰ ڈنڈ پیلو اور ۱۰۰ دفعہ اٹھک بیٹھک کرو بلکہ پہلے دن اگر ایک کر سکتا ہے تو ایک کرے اور دوسرے دن دو کر سکتا ہے، دو کرے۔

حکمت اور مصلحت، دین کے اثرات کو بڑھانے کے لیے ناگزیر اور ضروری ہے۔ اس کے بغیر عام لوگوں کو ساتھ نہیں لیا جا سکتا بلکہ وہ متنفر ہو سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ نعروں کے بل پر، ظلم کے خلاف، سرمایہ دار اور جاگیردار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ حقوق کی جنگ ہو گی اور ہمیں یہ کام بھی کرنا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر دین کی روح بھی پیدا کرنا ہو گی جو اصل چیز ہے۔ دینی روح پیدا کرانے کے لیے تدریج اور حکمت و مصلحت کا اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہو گا۔

مولانا مودودیؒ نے حکمت کے اسی پہلو کو ایک جگہ بڑے خوب صورت انداز میں واضح کیا ہے کہ ہم دین میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے۔ جو دین میں مطلوب ہے اس کو ہم دین میں مطلوب ہی بتائیں گے، اور جو دین میں منع ہے اس کو منع ہی بتائیں گے لیکن کسی وقت قوم کی استعداد دیکھ کر ان میں سے کسی چیز پر ہم

زور دیں گے اور کسی پر نہیں دیں گے، یہ حکمت کا تقاضا ہے۔ انھوں نے بہت واضح طور پر بیان کیا ہے کہ تقدیم، تاخیر یا ترجیحات کا نظام ہم حکمت سے قائم کریں گے۔ اسی طرح دین نافذ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ معاشرے میں جو عام چھوٹی چھوٹی برائیاں ہیں ان کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائیں تو یہ مناسب نہیں ہو گا۔ ہمیں کام کا آغاز بنیاد سے کرنا ہو گا۔ اس کے بعد بہ تدریج اقدامات ایک حکمت کے تحت اٹھانا ہوں گے۔

اس خدشے کے پیش نظر کہ دین میں آسانی سے دنیا پرست فائدہ اٹھالیں گے یا فتنہ برپا کر دیں گے، ہم یہ دروازہ ہی بند کر دیں تو اس سے دین محدود ہو جائے گا۔ دین کے ساتھ المیہ ہی یہ ہوا کہ اسے محدود کر کے رکھ دیا گیا اور بالآخر عملی زندگی سے خارج ہو کر یہ مدرسوں اور گوشوں کے اندر محدود ہو کر رہ گیا۔ ان خدشات کی بنیاد پر مختلف فتوے دیے گئے۔ لیکن ہمیں تو ان اصولوں کی پابندی کرنا ہے۔ جو اصولوں کا غلط استعمال کریں گے ہم ان سے کہیں گے کہ وہ غلط استعمال کر رہے ہیں۔ دین نے ہمیں جو بڑے اہم اصول دیے ہیں، ہم انھیں نہیں چھوڑ سکتے۔ شریعت میں کمی بیشی کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔

ترجیحات کا پہلو

قرآن مجید کی پوری تعلیم یہ ہے کہ پہلے بنیادی باتوں کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ بنیادی باتوں کی تعلیم کے بعد ہی اس پر دین کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کو پڑھا جائے تو ان میں احکام کی کوئی تفصیل نہیں ملتی بلکہ وہ اصول جو دین اور ایمان کے اہداف ہیں، وہ بیان کیے گئے ہیں۔

ایک جگہ اس طرح سے تعلیم دی گئی: فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰی ○ (الیل ۹۲: ۵-۷) "جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا، اور بھلائی کو سچ مانا، اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے"۔ بس تین باتیں اور کچھ نہیں، یعنی جس نے راہ خدا میں مال خرچ کیا، گناہوں سے بچا اور بھلائی کو سچ مانا۔ یہ بھی نہیں کہا کہ کس نے دیا، کتنا دیا، کس کو دیا اور کس کو نہیں دیا اور نہ یہ کہا کہ کہاں سے دیا؟ اصل چیز تو فیاضی ہے اور دینے کا جذبہ ہے۔ یہ پیدا ہو جائے تو بہت سے کام ہو جائیں گے۔ دل تنگ رہے گا تو بہت سے کام نہیں ہوں گے۔ اس لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کہ ہر چیز خدا کی امانت ہے، ہر چیز دینا ہے، وقت، مال اور یہاں تک کہ وقت پڑنے پر جان بھی۔ یہاں نیکی کے لیے حسنٰی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی بڑی خوب صورت اور بڑی پیاری چیز کے ہیں۔ نیکی کوئی بدصورت چیز نہیں ہے کہ آدمی اس سے متنفر ہو۔ اس طرح سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا، گناہوں سے بچنا اور بھلائی کو سچ ماننا جیسے بنیادی اصولوں کی صورت میں دین کی دعوت اور تعلیم مختصراً دی اور بات ختم کر دی گئی۔ ایک دوسرے مقام پر اس طرح تعلیم دی:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰی ○ (النزعٰت ۷۹: ۴۰-۴۱)

"اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہو گی"۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا گیا۔

یہ چیزیں ذہن میں منطبق چلی گئیں اور پھر ان پر شریعت کی عمارت تعمیر ہوئی۔ ان تعلیمات سے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا ہوا۔ اگر ہم ان دو چیزوں کو یعنی اللہ کا خوف اور تقویٰ کو نظرانداز کریں گے اور محض ظاہری مطالبات کریں گے تو لوگوں کے اندر کوئی استعداد پیدا نہیں ہو گی۔ ہماری اپنی استعداد سے کوئی معاشرہ قائم نہیں ہو گا۔ یہ اولین ترجیح ہونا چاہیے۔ پھر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ یہ ملک کروڑوں افراد کا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ سب کے سب لوگ کبھی بھی دین دار نہیں ہو جائیں گے۔ ہر قسم کے لوگ رہیں گے، زانی بھی، شرابی بھی۔ لیکن ان کی بڑی اکثریت کو مجموعی طور پر بھلائی کی طرف آنا چاہیے اور ان چیزوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ہی یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ان بنیادی تعلیمات کی بنیادوں پر دین کی پوری عمارت اٹھا سکیں۔ اس غرض کے لیے قرآن کی حکمت اور قرآن کا طریقہ تعلیم اور ترجیحات کا پہلو ہماری نگاہوں کے سامنے رہنا چاہیے۔

یہ بات بھی بار بار سامنے آتی رہتی ہے کہ ہم مسلمان معاشرے کے اندر کام کر رہے ہیں۔ اگرچہ لوگ بگڑے ہوئے ہیں، خراب ہیں لیکن ان میں کہیں نہ کہیں اسلام سے وابستگی پائی جاتی ہے۔ دل میں اسلام کے لیے جذبہ موجود ہے۔ چند افراد کے سوا کوئی بھی کھلم کھلا اسلام کا باغی نہیں ہے بلکہ اچھے اچھے باغی لوگوں کے دل میں بھی اسلام سے وابستگی کی کوئی نہ کوئی رمق ضرور پائی جاتی ہے جس کا وہ کبھی کبھار اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ گویا لوگوں کی بڑی تعداد کے دل میں اسلام کے لیے ایک چنگاری موجود ہے۔ راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپی ہوئی اس چنگاری کو کریدنا، اس کو نکالنا، اس سے کام لے لینا، یہ دراصل حکمت اور ترجیحات کا متقاضی ہے۔

ترجیحات کا یہ پہلو کتنا اہم ہے اس کا اندازہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک واقعے سے بہ خوبی ہو سکتا ہے۔ وہ سنت کے بہت بڑے اتباع کرنے والوں میں سے تھے۔ بہشتی زیور اور ان کی دوسری کتابوں میں جگہ جگہ بدعت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ انھوں نے ایک ایسی آبادی کی طرف مبلغ بھیجے جن کے نام بھی ہندوؤں کے سے تھے اور جہاں مسجدیں بھی نہیں تھیں۔ ان میں مسلمانوں والی کوئی چیز نہیں تھی۔ نماز بھی نہیں پڑھتے تھے، کلمہ بھی نہیں جانتے تھے۔ ہر لحاظ سے انھیں کافر کہا جا سکتا تھا۔ مبلغین نے ان سے پوچھا کہ تم کاہے کے مسلمان ہو؟ کہنے لگے ہم "تعزیے" بناتے ہیں۔ یعنی ہم اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم "تعزیے" بناتے ہیں۔ اب تو مبلغین بہت چکرائے۔ کہنے لگے کہ اب ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کو لکھ کر بھیجا گیا کہ ہماری رہنمائی فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی

ان کو یہ مت کہو کہ "تعزیے" بدعت ہیں۔ اس لیے کہ ان کا اسلام سے ربط "تعزیے" کی معرفت ہی ہے۔ اس ربط سے اگر تم نے انھیں کاٹ دیا تو یہ اسلام سے کٹ جائیں گے۔ پہلے ان کو ایمان کی تعلیم دو۔ اس کے بعد ان کو اسلام سکھاؤ اور جب وہ سیکھ جائیں تو پھر ان کو بتاؤ کہ "تعزیے" بدعت ہیں۔ انھیں چھوڑنا چاہیے۔ پھر وہ چھوڑ دیں گے۔

اسلام کا حکمت سے جو ربط ہے' اس کو پیش نظر رکھ کر اگر دعوت دی جائے تو جو لوگ کمزور' ضعیف' جاہل اور کمزور ایمان والے ہیں' ان میں قوت پیدا ہو جائے گی۔

اس وقت یہی مرحلہ ہمارے سامنے ہے اور دعوت کے اصولوں کا بھی یہی تقاضا ہے۔ خاص طور پر اس اصول کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں اللہ سے تعلق جوڑنا ہے اور سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ لوگوں کا کسی نہ کسی انداز میں اللہ سے تعلق بھی ہے۔ لوگ ماشاء اللہ' ان شاء اللہ کہتے ہیں' لاحول ولا قوۃ کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ گویا لوگوں میں جذبہ پایا جاتا ہے اور کسی نہ کسی انداز میں عمل بھی ہے۔ بس ان کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خود بھی دین کے ان اصولوں اور ترجیحات کو سیکھا جائے جن پر دین کی بنیاد ہے اور دوسروں کو بھی سکھایا جائے۔

حکمت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ مسلمانوں کا' اس امت کا' دین اسلام سے جو بھی ربط قائم ہے اس کو استعمال کیا جائے' مزید بڑھایا جائے اور پھر اس بنیاد پر دین کی عمارت تعمیر کی جائے۔ اگر غلط ربط ہے تو اس کو فوراً نہیں کاٹ دینا چاہیے بلکہ اس وقت کاٹنا چاہیے جب اس کے بدلے دوسرا ربط قائم ہو جائے۔ جب اصل ربط قائم ہو جائے گا تو اسے کاٹ دینے سے کوئی مسئلہ نہ ہو گا۔ اگر ابتدا ہی میں کاٹ دیا جائے تو وہ اسلام کی رسی سے ہی کٹ جائیں گے اور کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔ یہ اسلام نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو لا الٰہ الا اللہ کہے وہ مسلمان ہے۔ جان کے خوف سے بھی اگر کوئی کہے تو وہ مسلمان ہے۔ بہت سی احادیث ہیں جن میں آپؐ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کلمہ گو کی تکفیر نہیں کرنا چاہیے۔ ہر جگہ آپؐ نے سہولت دی اور ہر جگہ آپؐ نے معافی و درگزر کا راستہ اختیار کیا۔

وسعت نظر

ایک اور اہم پہلو وسعت نظر ہے۔

آپ نے یہ آیت بار بار پڑھی ہے: لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ (الحشر ۵۹:۲۰) "دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے"۔ اس کے اگر یہ معنی لیے جائیں کہ آخرت میں دونوں کے ساتھ برابر سلوک نہیں ہو گا تو یہ صحیح معنی ہیں لیکن ان معنوں میں گہرائی نہیں ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ آخرت میں' جو جنت میں جائے گا وہ الگ معلوم ہو گا اور جو دوزخ میں

جائے گا وہ الگ معلوم ہو گا۔ میری اپنی فہم کی حد تک اس کا اطلاق دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ دنیا میں جو اصحاب جنت ہیں، جنت میں جانے والے ہیں، وہ یہاں بھی الگ نظر آتے ہیں، اور جو اصحاب نار ہیں، جہنم میں جانے والے ہیں، وہ بھی یہاں الگ نظر آتے ہیں۔ اس دنیا کے اندر بھی دونوں برابر نہیں نظر آسکتے۔ دونوں مختلف ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جنت کی تعریف یوں کی ہے: وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۳۳) ''دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے''۔ اس کے معنی ہیں کہ جو اس جنت کی طلب میں ہو گا جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں، اس کا دل بھی اتنا ہی وسیع ہونا چاہیے ورنہ جنت کہاں سماتی ہے۔ جنت تو پہلے دل میں سماتی ہے۔ جس کا دل اتنا وسیع نہ ہو، نظر اتنی بلند نہ ہو وہ اس جنت کا حق دار کیسے بنے گا؟ جس کا دل وسیع ہو گا وہ اللہ کے ایک ایک حکم پر عمل کرے گا۔ وہ مال بھی لٹائے گا، وقت بھی دے گا اور راہ خدا میں جان بھی دے گا۔ اگر لوگوں سے خطائیں ہوں گی تو انھیں معافی بھی دے گا، اور غلط کاروں اور گناہ گاروں کو بھی ساتھ لے کر چلے گا۔ اسی لیے یہ بات واضح ہے کہ جو جنت چاہتا ہے وہ دنیا کے اندر اس لحاظ سے ممتاز ہو گا کہ اس کا سینہ اور دل وسیع ہو گا، نظر میں وسعت ہو گی، چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نہیں جھگڑے گا بلکہ بڑی بڑی چیزوں سے اپنا تعلق رکھے گا، ان کو لے کر آگے بڑھے گا اور تمام انسانوں کو اپنے جلو میں سمیٹ کر چلے گا۔

اگر آپ غور کریں جہاں قرآن نے جنت کی طرف اس حوالے سے دعوت دی ہے کہ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضُ، اس کے فوراً بعد یہ فرمایا: الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۳۴) ''جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں''۔ گویا جن کے دل وسیع ہوں گے وہ مال بھی خرچ کریں گے، جان بھی دیں گے، شہید بھی ہوں گے، معاف بھی کریں گے، اور غصہ بھی پی جائیں گے۔ بعض دفعہ لوگ انتقام لینے کی غرض سے آدمی کو ذلیل کرنے پر تل جاتے ہیں۔ اس کے لیے سمندر کے برابر ظرف چاہیے کہ آدمی غصے کو پی جائے اور معاف کر دے۔ یہ وسیع القلبی اور وسعت نظری کے بغیر ممکن نہیں جو کہ اہل جنت کے اوصاف میں سے ہے۔

دوسروں کے قصور کو معاف کر دینے کے حوالے سے ایک اہم مثال غزوۂ احد کی ہے، جب فتح شکست میں بدل گئی۔ لوگوں نے اس موقع پر حضورؐ کے ساتھ کیا نہیں کیا۔ مگر یہاں بھی اللہ نے یہی ہدایت دی: وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹) ''ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعاے

مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ کرو"۔ یہ وہ لوگ تھے جو جہاد کے اندر پیچھے ہٹ گئے تھے اور آپؐ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، نتیجتاً شکست ہو گئی تھی۔ مگر اس موقع پر بھی وسعت قلبی اور عفو و درگزر سے کام لینے کی ہدایت کی گئی۔ یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے لوگ آپؐ کے گرد بھیڑ کی طرح گروہ در گروہ جمع ہو گئے۔ اسی بات کی طرف قرآن نے یوں اشارہ کیا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ج (اٰل عمرٰن ۳: ۱۵۹) "(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے"۔

لہٰذا جنت کی طلب کے معنی تو یہ ہوئے کہ دل و نظر میں وسعت ہو، عزائم اور حوصلے بلند ہوں، نہ کہ تنگ نظری کا مظاہرہ کیا جائے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی معمولی بحثوں میں الجھ کر نہ رہا جائے۔ ان باتوں میں سے کسی کا تعلق بھی اس نئی تہذیب سے نہیں ہے جو دنیا میں تعمیر ہونے والی ہے۔ وہ جماعت جو اس لیے کھڑی ہوئی ہو کہ وہ ساری دنیا کی امامت سنبھال کے ایک نئی تہذیب تعمیر کرے گی، اس کو کہاں فرصت ہو سکتی ہے کہ وہ ان چھوٹے چھوٹے مسائل میں تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے الجھی رہے۔ اس جماعت کو تو وسیع النظر، وسیع القلب اور اپنی رائے کی قربانی جیسی صفات سے مزین ہونا چاہیے جو جنت کے طلب گاروں کا خاصا ہے۔

دعوت دین اور فریضہ اقامت دین کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ دعوت عام کا کام اعتصام باللہ، حنیفیت، دین میں آسانی، تدریج، ترجیحات اور وسعت نظر جیسی بنیادوں کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے۔ جب اس وسعت قلبی اور وسعت نظری کے ساتھ آپ لوگوں کے پاس جائیں گے، دعوت عام دیں گے تو لوگ بھی ساتھ چلیں گے اور آیندہ کے مراحل بھی آسان ہوں گے۔ ان شاء اللہ! (کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)۔

(کتابچہ دستیاب ہے، منشورات، منصورہ، لاہور)